

عائشہ خان

# دل میں تجھی آجیو



”امی جان! مجھے یہ شادی وادی ہرگز نہیں کرنی۔ بس آپ صاف صاف پھوپھو کو بتادیں۔“  
 ”میں۔۔۔ ہیں، دماغ تو نہیں چل گیا، کیا الٹی سیدھی ہانک رہی ہو۔“ انہوں نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں امی جان، مجھے انزلہ آیا اور ارمان والا حال قطعاً قبول نہیں کیا رکھا ہے شادی میں ہر وقت کی طعن و تشنیع، سرزنش اور ملامت۔۔۔ وہ بے حد تلخی سے بھری۔“

”عروہ! کیسی پاؤں جیسی باتیں کر رہی ہو، ہر لڑکی کا اپنا مقدر ہوتا ہے اپنی پھوپھو کو دیکھو کیسی جان دینی ہیں تم پر۔ یہی حال راول کا ہے تم تو بڑی بخت آور ہو بیٹی۔ ایسا سسرال تو شاذ و نادر ہی ملتا ہے اور پھر۔۔۔“ ان کا جملہ ابھی منہ میں ہی تھا کہ راول کی موٹر سائیکل کے بارن نے اس کے آنے کی اطلاع دی اور عروہ کا دل حسب معمول بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ اللہ کس قدر مشکل ہے من چاہے بندے سے منہ موڑنے۔ زندگی میں سارے رنگ تو اسی شخص اور اس سے وابستہ بندھن کی بدولت ہیں۔ یہ تصویر ہی کس قدر ازیت ناک ہے کہ اس شخص سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اس سوچ کے ساتھ ہی اس نے خود کو کرب کی گہری کھائیوں میں اترتا محسوس کیا۔

”سنو عروہ! خبردار جو تم نے راول سے کوئی الٹی سیدھی بک بک کی تو۔“ امی جان نے سختی سے اسے تنبیہ کی اور وہ خالی خالی نگاہوں سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔  
 ”ابھی وہ ہمیشہ کی طرح مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔“  
 ”السلام علیکم مہلانی جان! واہ آج تو بڑے موقع پر آیا ہوں۔“ اس نے ایک شوخ سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور پلٹ اپنی طرف کھکھکاتے ہوئے پکڑا اٹھا کمرنہ میں رکھ لیا۔

”دیری۔۔۔ سنی۔۔۔“ اس نے مزے سے چٹخا لیتے ہوئے کہا۔ ”مہلانی جان! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ مہماتار ہی تھیں کہ آپ کے پاؤں میں موج آگئی ہے۔“ اب وہ توجہ سے امی جان کی طرف دیکھتا ہوا

عجبت سے بوجھ رہا تھا۔

”یوہی معمولی سی موج تھی، آئیوڈینس کی مالش کی تھی انزلہ نے۔ اب تو ٹھیک ہے۔“ انہوں نے پیار سے اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”عروہ راول کو چچی چائے دو۔“ انہوں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔  
 ”یہ لیں چائے۔“ وہ کپ اس کی طرف بڑھائے پیچھے سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ راول نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”اوہو میں نے تو کوشش چڑھایا ہوا تھا۔“ امی جان جلدی سے اٹھتے ہوئے بولیں۔ وہ بظاہر سر دھری کا مصنوعی لبادہ اوڑھے تھی مگر دل کو نگاہ کو اس کی سے انائی نگاہوں سے کیسے بچا رہی تھی یہ وہی جانتی تھی۔  
 ”کیا ہوا۔۔۔ چائے نہیں پینی؟“ اس کی بخور تھی، جاچتی نگاہ سے گھبرا کر اس نے پوچھا۔

”یہ خوب صورت ہاتھ اگر زہر بھی پلا میں تو میں شوق سے پی لوں گا یہ تو پھر چائے ہے۔“ اس کے لیے میں دھڑکتے الوہی جذبے ایک لمحے کو اسے ڈگمگائے لیکن اگلے ہی بل اس نے خود کو سنبھل لیا اور چائے اس کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے درختے میں جا کھڑی ہوئی۔ راول اس کے اس گریز پر حیران رہ گیا پھر وہ اس کے پیچھے آکھڑا ہوا اتنے قریب کہ اس کے بدن سے اٹھتی کولہوں کی وافر قریب مہک عروہ کو بے خود کر لے گئی۔ اسے اپنی اٹھل پھل ہوتی دھڑکتوں کو سنبھالنا دشوار ہو گیا۔ وہ جو اس کے بچپن کا دوست تھا۔ اس کا حبیب تھا۔ جو رگ جال سے چھنی قریب تھا۔ اس کے جذلوں کو رد کر کے ہوں یکہ یک اس سے منہ موڑ لیا جس قدر محال تھا۔ عروہ آخر کیا کرتی، انزلہ آیا کی زندگی جیسے روتے سکتے گزرتی تھی وہ تو جس کے سلسلے تھی اس پر مستزاد یہ کہ ہمسائے میں بھان کو خوند لے جو اس کا کچھ خالہ زاد بھی تھا، طلاق دے کر بچے کو اس سے چھین کر اسے گھر سے نکل دیا تھا۔ عروہ جو پہلے ہی شادی سے خوف زدہ تھی مگر امید و بیم کے گرداب میں چکرار رہی تھی اس واقعہ نے اسے اس بندھن شادی سے بالکل ہی برگشتہ کر دیا۔ پھوپھو، ساس کے روپ میں

اور راول خاوند کے روپ میں عجیب عجیب اور ڈراؤنے ہونے لگا کر اسے ڈرانے لگے۔ اس کا سکون و چین بالکل تباہ ہو کر رہ گیا۔ پتا نہیں کیسے کیسے خدشے اور وابہ ہر وقت اسے گھیرے میں لیے رہتے۔ وہ سوچتی کیا فائدہ اس تعلق کا۔ اس رشتے کا جس میں ظاہری قربتیں تو بڑھ جائیں مگر روحانی روابط ناپید ہو جائیں۔ جس میں جسمانی لحاظ سے تو انسان ایک دوسرے کے قریب ہو لیکن روحانی طور پر دور ہو۔ جس میں ظاہری دوریاں تو مٹ جائیں لیکن باطنی بعد میں اضافہ ہو جائے۔

بہت سوچنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ راول سے شادی نہیں کرے گی اس طرح کم از کم اس کے پاس محبتوں اور چاہنوں سے لبریز کچھ لفظ تو ہوں گے چاہے جانے کا فخر بھرا کیف آگیاں احساس تو اس کی یادوں کے چمن میں مہکتا رہے گا۔ زیست کی کلیوں سے نگاہ چرا کر ماضی کے خوشگوار لحظات سے چند ساعتیں مستعار لے کر جب وہ اس چمن میں رہ فون لانے کو کھوجے گی تو زندہ رہنے کے لیے اور زندگی کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لیے زاوراہ کے طور پر بہت کچھ ملے گا۔

مگر اب جب اس فیصلے پر عمل کی گھڑی سر پر پہنچی تو اسے احساس ہوا کہ یہ فیصلہ کرنا تو سہل ہے مگر اس پر عمل کرنا بے حد دشوار ہے۔ دل تو اسے دیکھتے ہی مچلنے لگا تھا عروہ تیرہ کر چکی تھی کہ دل کے کسے میں نہیں آئے گی۔ دل کا کیا ہے یہ تو ضدی بالک کی مانند ہے اور ہاں کی ساری ضدیں کب پوری کرنے کی ہوتی ہیں۔ اس نے سوچا اور اس کی عمر طویل آنکھوں سے ٹھٹھکتے پتلیوں سے خود کو بچائی وہ تیزی سے گھرے سے نکل گئی اور راول گنگ سا کھڑا رہ گیا۔ بہت زیادہ باتیں تو وہ پہلے ہی نہیں کیا کرتی تھی مگر قطعاً "لا تعلق" اور سردی لیے یہ انداز تو اس کے لیے بالکل نیا تھا اور بے حد ایف وہ بھی۔

وہ آؤٹ پر اسلام آباد جا رہا تھا اور اس وقت سب ملے خاص طور پر اسے جاتے وقت دل بھر کر دیکھنے

ہی کی غرض سے آیا تھا۔ دل کیفیت پہلے ہی کچھ عجیب سی ہو رہی تھی اور وہی سہی کسر اس کے رویے نے پوری کر دی تھی۔ وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ اس سے ایسی کون سی خطا سیر زد ہو گئی تھی جو وہ یوں اس سے بے اعتنائی برت رہی تھی؟ راول کا ذہن بے حد پراگندہ سا ہو رہا تھا۔ وہ مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر لیے کچھ دیر ماموں ممانی کے پاس بیٹھا رہا۔ دل میں یہ امید بھی تھی کہ شاید وہ لبوں پر وہی شرمیلی سی مسکراہٹ لیے اچانک آکر اسے حیران کر دے، شاید وہ یونہی اسے تنگ کر رہی ہو مگر جب گفتنی ہی دیر گزر گئی اور اس نے آکر جھانکا تک نہیں تو راول کو اپنی خوش فہمیوں پر سخت فیصلہ آیا۔ نعت ہے تم پر راول تمہیں بھی یہی لڑکی ملی تھی دل جیسی انمول متاع لنانے کو۔ اس نے انتہائی رنج اور کوفت کے عالم میں خود کو ڈپنا اور بے دلی سے ماموں ممانی سے ملنے کے بعد شکستہ دل اور مایوس کوچہ جاناں سے نکل آیا۔

سارا راستہ عجیب سی بے کلی نے اس کے وجود کا احاطہ کیے رکھا۔ ڈھیلے ڈھیلے سے انداز میں چلتا جب وہ گھر میں داخل ہوا تو ماما اور شبنم اسے اتنی جلدی آتے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"خیریت تو ہے بھائی کہیں کالی ملی تو راستہ نہیں کاٹ گئی ویسے اتنے وہی آپ لگتے تو نہیں ہیں کہ راستے سے ہی پلٹ پڑیں۔ خاص طور پر جب راستہ بھی عروہ کے گھر کا ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

"میں زرا دیر کے لیے ملنے گیا تھا۔ وہیں رات بسر کرنے کا تو ارادہ نہیں تھا میرا۔ اور یہ تم کیا ہر وقت عروہ کے نام کی مالا چپتی رہتی ہو؟" اس کے روٹھے لہجے پر ماما اور شبنم دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا وہ کچھ آکتایا آکتایا اور پریشان سا نظر آیا۔

"کیا بات ہے راول! کوئی الجھن یا پریشانی ہے؟" انہوں نے حلاوت بھرے انداز میں پوچھا۔

"نہیں ماما ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے ایسا کیوں محسوس کیا ہے۔؟" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے نارمل سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔



”ہم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو راول بیٹا! بھائی صاحب کے گھر تو خیریت تھی؟“  
 ”محب ٹھیک ٹھاک ہے ماما، ممائی جان کہہ رہی تھیں کسی وقت آپ چکر لگائیے گا، شبینہ! تم نے میری شرٹس واش کر دی تھیں؟“ ماں کے مزید کسی سوال سے بچنے کے لیے وہ جلدی سے شبینہ کی طرف مڑ کر پوچھنے لگا۔

”کب کی۔۔۔ پریس بھی کر دی ہیں میں نے۔“  
 اس نے جلدی سے بتایا۔  
 ”واہ بھئی بڑی سکھو بی بی بن گئی ہے ہماری شبینہ تو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے کہا۔ مگر اس کے چہرے پر چھایا غبار شبینہ کی انگاہوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ بھائی کے پیچھے ہی چلی آئی۔  
 ”کیا ہو گیا بھائی۔۔۔؟ کہیں عروہ سے جھگڑ کر تو نہیں آ رہے؟“ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی راز داری سے پوچھنے لگی۔

”بات مت کرو اس بد تمیز لڑکی کی اتنی دور سے ملنے گیا تھا مگر سیدھے منہ بات تک نہیں کی جنبہ نے۔ حد ہوتی ہے بے مروتی کی۔“ وہ جو بے حد بھرا بیٹھا تھا بے اختیار کہہ گیا۔

”کمال ہے بھائی، اتنی سی بات پر آپ یوں مواصلاتی غبارے کی طرح پھول رہے ہیں ممکن ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو، ماموں، ممائی سے ڈانٹ بڑی ہو۔ آفتاب سے جھڑپ ہو گئی ہو یا پھر وہ انزلہ آیا کی وجہ سے پریشان ہو۔ کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔“ اس نے اتنے ہلکے پھلکے انداز میں بات کی کہ وہ اس کی عقل مندی کا قائل ہو گیا اور بڑی حد تک مطمئن بھی۔

☆ ————— ☆

وہ چار لڑکے تھے جو اپنے کالج سے آؤٹ پر آئے تھے۔ بے حد محنت طلب کام تھا۔ سارا سارا دن مغز ماری کرنی پڑتی۔ دماغ شل ہو کر رہ جاتا۔ لیکن جو نسی ذرا سی فرصت میسر آتی وہ چیم سے اس کے تصور میں آمو جو دہوتی اور ساری تھکن پل میں ہوا ہو جاتی۔

وہ برسات کی بھیگی بھیگی سے روج پرور شام تھی جب وہ ایک ماہ یعنی پورے مہینوں کے بعد نگاہوں میں دید کی پیاس اور دل میں ہمت کے شوریدہ سر جذبوں کے ساتھ کوچہ جاناں میں داخل ہوا۔

سی گرین کاشن کے شلوار سوٹ میں ملبوس اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ وہ سامنے ہی انزلہ آئی کے ساتھ محو گفتگو تھی، ساتھ ساتھ سبزی بن رہی تھی۔

”السلام علیکم! محترم خواتین۔“ اس کے بر جوش سلام پر عروہ نے بمشکل اپنے اٹھل پٹھل ہونے دل کو سنبھال کر نگاہیں اٹھائیں۔ وہ تمام تر احتیاط بالائے طاق رہنے، ایک ٹک اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

جینز کی اپینٹ اور جدید طرز کی سلی ہاف آستین کی ٹی شرٹ میں وہ ہمیشہ سے زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کی راہ دل میں کھسا جا رہا تھا اور وہ اپنی تمام تر طاقت صرف کیے دل کو سمجھانے میں، متانے میں مصروف تھی۔ مگر اس کی تمام تر سعی اس کی سحر طراز آنکھوں سے پھلکتے فصول خیز جذبول اور بے نائیوں کے سامنے اکارت جاتی نظر آرہی تھی۔ وہ تو اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر رہا تھا۔ اس کے اندر باہر ہر طرف وہ ہی وہ تھا۔ ایسے میں کس قدر مشکل تھا اس سے پہلو تھی کرنا۔

کتنے بے شمار صدیوں جیسے دنوں کے بعد وہ اس کے سامنے اپنے حسن کی تابانیاں بکھیر رہی تھی اس کے اندر تک سکون اتر آیا۔ ہر طرف سکھ ہی سکھ تھا۔ شانتی ہی شانتی تھی۔

”کیسے ہو راول؟ کب آئے اسلام آباد سے؟“  
 انزلہ آبانے پوچھا تو وہ اپنی بے خودی پر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ ”کچھ دیر قبل ہم تمہارا ہی ذکر کر رہے تھے۔ آج میں نے شامی کباب بیٹائے ہیں اور عروہ نے پکوڑے تھوڑے لائی ہوں۔ تم کھا کر بتانا کس کی ڈش ہے۔ ویسے ہمیں تو عروہ ہی کی لگے گی۔“ انہوں نے اسے جھل سا دیکھ کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔ ان کے نکلتے ہی وہ بھی اٹھنے کے لیے



نظر آنے لگتی ہے یہ اسے آج اسی بل معلوم ہوا تھا۔

وہ اس کی متاع جاں بھی وہ جو اس کے لیے کل کائنات تھی جو اس کی آنکھوں کا سب سے حسین خواب تھی جس کی محبت اس کے وجود کی بقا تھی زیست کی ساری خوشیاں ساری سرسبز ساری خوب صورتیاں اسی کے دم سے تو تھیں۔ بے شک زبان سے وہ اس کی محبت کا اقرار نہیں کیا کرتی تھی مگر وہ جب بھی محبت پاش نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتا اس کی آنکھیں جھک جھک جاتیں۔ پلکیں بڑے ہی دلفریب انداز میں اٹھنے کرنے لگتیں۔ راحروں پر شوق پھوٹ پڑتا۔ وہ کوئی شوخ سامعنی خیر جملہ کہہ گزرتا تو ایک بے حد دلکش رہے حد فسون خیر شریلی سی مسکن اس کے لبوں کی تراش میں آہستی، کبھی کبھی جب وہ نگاہ چرا کر دیکھ رہی ہوتی تو اس کی نگاہوں میں محبت کے الوہی رنگ راول کو صاف نظر آتے مگر شاید وہ سب میرا حسن ظن تھا۔ تمہاری نگاہوں سے چھلکتی جاہت میرا واہمہ تھی تمہاری جھکی پلکوں کی وہ سحر انگیز جنبش میرا دلفریب خیال تھی۔ تمہارے چہرے پر مجھے دیکھ کر فوس فوج کے جو رنگ بکھرتے تھے وہ میرا خواب تھے اس نے بے حد افسردگی سے سوچا اور گاڑی قائد اعظم لاہر پر ہی کے ساتھ پارک کر کے شکستہ سے انداز میں باہر نکل آیا۔ اتنی جلدی کہہ جا کر ماما اور شبنم کے سوالوں کے جواب دینے کی ہمت نہیں پارہا تھا خود میں۔ شبنم نے کیسے کھلکھلاتے ہوئے تاکید کی تھی۔ ”بھائی وہاں جا کر بھول مت جا بچے گا کہ گھر پر بھی کوئی آپ کا منتظر ہے۔“

”اپنی ایک ہی بسن کو بھلا سکتا ہوں بھلا میں۔“ راول نے سارے اس کے بال بکھیرتے ہوئے کہا تھا۔ ”اور تمہیں تو شاید نہ بھولیں مگر جہاں آپ جا رہے ہیں نا۔ وہاں جا کر سب کچھ بھول سکتے ہیں۔“ وہ شوخی سے کہتی بائے بائے کرنی اندر بھاگ گئی اور وہ مگن و مسرور گاڑی میں آبیٹھا تھا۔ وہ جو سارے راستے تصور ہی تصور میں اسے اپنا پر جوش استقبال کرتے دیکھتا آیا تھا وہاں پہنچ کر وہ حیران و پریشان رہ گیا۔ سارے

تو لنے لگی۔

”کیسی ہو عروہ۔“ اس کی بھاری پرکشش آواز اسے کمزور کرنے لگی۔ اف کس قدر مشکل ہے دل پر یوں جبر کرنا اور اس سے بھی دشوار ہے اس دل میں بسنے والوں پر ستم ڈھانا۔

”ٹھیک ہوں۔“ بمشکل لہجے میں بے رخی کا تاثر لاپائی راول اس کے اس کھنچے کھنچے سے انداز پر الجھا مگر لاپرواہی ہم سمجھتے ہوئے نارمل ہو گیا۔

”مجھے یاد کیا تھا؟“ وہ محبت بھری نگاہوں سے اسے مستند ہم سر میں پوچھ رہا تھا اور عروہ کا راول راول ہاں پکارنے لگا تھا مگر زبان پر خاموشی کا قفل تھا۔ ”میں تو ایک بل بھی تمہارے خیال سے تمہاری یاد سے بے خبر نہیں رہا ہر دم تمہاری صورت نگاہوں کے سامنے رہتی تھی کیا تم نے بھی مجھے یاد کیا تھا عروہ؟“ جذبوں سے محبتوں سے ہلکی ہلکی آواز میں اس نے پوچھا۔

”شاید نہیں۔“ لفظ اس کی زبان سے نکلے اور دل سے تڑپ اٹھا۔ نالہ و فریاد کرنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ابھی تختہ ہو جائے گی ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھر جائے گی۔ اس کا دل جاپا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے کس قدر ظالم تھی وہ اس دل میں اس کی محبت بستی تھی اسی دل میں یہ کیسا حال مارا تھا اس نے۔ وہ گنگ سا پھیٹی پھیٹی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے ضبط کا واسن تار تار ہوتا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے سے نکل گئی۔

راول کتنی ہی دیر پتھر کے مجسمے کی مانند ساکت و جامد کھڑا رہا اس کی ساری خوشی بے تابی و بے قراری دھری رہ گئی۔ وہ کسی سے بھی ملے بنا تیزی تیز چلتا گاڑی میں آبیٹھا اور اگلے ہی لمحے اس کی گاڑی گیٹ سے باہر تھی۔ امیدیں کیسے ٹوٹ جاتی ہیں ارمان کیسے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں اور سینوں میں کیسے آگ لگ جاتی ہے اور دل جب ٹوٹتا ہے تو انسان کیسے کرچی کرچی ہو کر بکھر جاتا ہے۔ زندگی کیسے ایک دم بے کار سی تھی

خیال، سارے خواب، ساری توقعات دم توڑ گئیں۔  
اسے دکھ کر اس کے احمریں لبوں پر تبسم کی ضیا میں تو  
کیا پھوٹتیں ان لبوں سے تو کوئی حرف مروت بھی نہ  
نکلا۔ نہ رخساروں پر سرخی چمکی نہ نگاہوں میں بے تابی  
جھلکی، سلام یوں پہنچ مارا جیسے وہ ایک ماہ بعد نہیں ایک  
سیکنڈ کے بعد دوبارہ سر پر آسوار ہوا ہو۔

بڑھ رہا تھا۔ اپنی پسندیدہ گراؤنڈ پر اس نے نگاہ تک نہ ڈالی  
تھی۔ حالانکہ ٹیس کھیلنے کے بعد چند منٹ وہ ضرور اس  
گراؤنڈ کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ گولائی میں بنی اس گراؤنڈ  
میں ہمیشہ بڑی عموگی اور توازن سے مشین پھری ہوتی  
تھی۔ چاروں طرف بنی کیاریوں کے درمیان چلتا ہوا  
نگاہوں کو تراوٹ بخشتا تھا۔ پہاڑی سے بہتا پانی مصنوعی  
آبشار فواروں کے جلنے کی سترخم آواز اور موتیوں کی  
طرح ادھر ادھر گرتا پانی اسے مہسوت سا کر دیتا تھا اور وہ  
کئی کئی منٹ وہاں کھڑا رہتا تھا۔ آج ایک لمحے کے لیے  
بھی اسے پایہ زنجیر نہ کر سکا جنوب کی سمت چلتے چلتے وہ  
مسجد کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں ایک لمحے کے لیے رک کر  
اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ شام اتر آئی تھی اور  
ہر چیز اس کے دل کی طرح ویران اور افسردہ دکھائی دے  
رہی تھی۔ پرندے تھکے تھکے اپنے ٹھکانوں کی طرف  
محو پرواز تھے۔ مسجد سے ذرا آگے دوسرے ہاتھ پر  
فوارے کے بالمقابل جو گراؤنڈ تھا وہ حسب معمول  
سنسان بڑا تھا۔ اجڑی اجڑی اپنی تنہائیوں پر ماتم کنال  
تھکے تھکے قدموں سے چلتا وہ کونے میں رکھے بیچ پر جا  
بیٹھا۔ اس گراؤنڈ میں جہاں بیٹھنا اسے بھی پسند نہیں  
ریا تھا اس وقت یہی اسے گوشہ عافیت محسوس ہو رہی  
تھی۔ اچھے خاصے رقبے پر پھیلی اس گراؤنڈ میں کوئی چیز  
بھی تو قابل ذکر نہیں تھی۔ خاصے فاصلے فاصلے پر دو چار  
کیاریاں اور بیچ تھے بے توجہی کا شکار گھاس اکثر بے  
روتق ہی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بھی اسے اپنی طرح شکستہ  
دل اور بے حد دھمی دھمی محسوس ہوئی۔  
کس قدر ظالم ہو م عروہ حسین۔ مگر تم سدا کی ستم  
شعار ہو میں ہی تم سے غلط توقعات وابستہ کر بیٹھا تھا۔

بہت سے گزرے منظر، بہت سے گزرے دن اور ان  
دنوں سے وابستہ یادیں اسے اپنی طرف بلانے لگیں۔  
اور جب راول نے وقت کے بارگراں تلے دلی  
یادوں پر سے گرد جھاڑی تو یہ جان کر اس کا وجود بھر بھری  
میٹی کا ٹوہ بن گیا کہ اس کی یہ کزن جو اس کی محبت بھی  
تھی اور منگیتر بھی شروع سے ہی بچپن سے ہی اسے  
بے وقوف بناتی رہی تھی۔ خود شرارت کر کے اس کا نام  
لگا دیتی، جس کی وجہ سے کئی مرتبہ غلطی نہ ہونے کے  
باوجود راول کو ڈانٹ بھی پڑی اور مار بھی۔ کئی دفعہ اس  
نے اس کی کاپیاں گندی کر دیں، کتابیں پھاڑ دیں، لیکن  
ان سب کے باوجود نہ راول نے اس سے کھیلنا ترک کیا  
نہ ہی وہ اسے کبھی بری لگی۔ اس بات پر راول کو کبھی  
کبھی بڑی حیرت ہوا کرتی تھی مگر یہ عروہ کا وہ دور تھا جب  
دل کے نمایاں خانوں میں چھپے جذبوں کو سمجھنے کی نہ  
صلاحیت تھی نہ شعور۔

جب ابو کا ٹرانسفر پٹنہ ہو گیا اور وہ پٹنہ جا  
گئے تو اس وقت راول کو سب سے زیادہ دکھ اسی  
پچھڑنے کا تھا اور اسے ہی یاد کر کے وہ بے حد افسردہ  
ہو جایا کرتا اور سوچا کرتا کہ کب وہ لاہور جائیں گے  
کب وہ اس سے ملے گا۔ دن جیسے گن گن کر  
رہے تھے اور گرمیوں کی چھٹیوں میں جب وہ لاہور  
جائے گا تو اس سے ملنے کے خیال سے وہ  
خوش تھا جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔  
مگر وہاں پہنچ کر اسے بے حد مایوسی ہوئی۔ وہ  
ماموں کے ہاں اسلام آباد جا چکی تھی پندرہ دن وہ  
لاہور رہے مگر راول کا کسی کھیل میں قطعاً  
اس کے بعد کافی عرصہ ماما پاپا لاہور جانے کا  
نہ بنا۔ اور وہ چاہتے ہوئے بھی خواہش رکھتے  
اکبلا بھلا کیسے جاسکتا تھا۔ وہ ایک خوب صورت  
تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی سی خنکی بڑی روح پروری  
ہو رہی تھی۔ کھیلنے کے بعد وہ تھوڑی دیر وہاں  
کے ساتھ گپ شب لگایا کرتا تھا مگر آج  
تھی کہ کسی بات میں چارم محسوس نہیں  
دل چاہتا تھا فوراً "گھر پہنچ جائے آخر"

اجازت لیتا کلب سے نکل آیا۔

چمک بر حیران سی ہو کر رہ گئی۔

”کیسی ہو کرن؟“ وہ حد درجے اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

”فائن۔“ ڈھیرے سے کہتے ہوئے عروہ نے دیکھا اس کی نگاہیں اب بھی بے تابی سے اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ کیسی تھیں یہ آنکھیں پیار لٹاتی، جذبے چھلکاتی، وہ بے تحاشا جھک محسوس کرنے لگی۔ دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔

”ماموں کب تک آجا میں گے عروہ؟“ شبینہ نے پوچھا۔

”کہہ تو رہے تھے دو اڑھائی گھنٹے تک آجاؤں گا۔“

”کیس گئے ہیں ماموں جان؟“ اس نے پوچھا۔

”جی۔۔۔ وہ ابی جان کو چین سے آئی ہوئی کسی پارٹی کو ریو کرنا تھا۔ لیٹ ہو رہے تھے اس وجہ سے مجھے گیٹ پر ہی اتار کر چلے گئے تھے۔“ اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے بتایا۔ اس کے اس انداز پر بے اختیار راول کے لبوں پر مسکراہٹ آٹھری۔ بڑی ہو کر کس قدر شرمیلی سی ہوئی ہے عروہ۔ لگتا ہی نہیں یہ وہی شرارتی لڑکی ہے جو اکثر اسے بلاوجہ پٹوایا کرتی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ شبینہ ابھی اندر گئی تھی اور وہ راول کے یوں ایک ٹک دیکھنے پر گھبرا اٹھی تھی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں راول بھائی؟“ اس نے اتھل پھٹل ہوتے دل کو مضطرب سمجھاتے ہوئے پوچھا۔

دل چاہا اسے بتائے کہ وہ کیسے پل پل اسے یاد کرتا رہا ہے۔ وہ جانے کس وقت چپکے سے اس کا سب کچھ چرا کر لے گئی ہے یوں کہ اب سے پہلے اسے خود بھی اس چوری کا پتا نہیں چلا۔ بے اختیاری کی سی کیفیت میں ممکن ہے وہ کچھ کہہ ہی گزرا مگر اسی وقت شبینہ جوس کے تین گلاس ٹرے میں رکھے کمرے میں داخل ہوئی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”میں صرف جوس اس لیے لائی ہوں کہ پہلے تم فریش ہو جاؤ شاور لے کر۔ تب تک میں پیٹ پوجا کا

ریکٹ گھماتا وہ جونہی گیٹ سے اندر داخل ہوا شبینہ سے گلے ملتی اس ہستی پر نگاہ پڑتے ہی اس کے اٹھتے قدم تھم سے گئے۔ پل کے ہزارویں حصے میں اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اور دھڑکنوں میں ایک شور مچا تھا۔ آرزوؤں کے نگار خانے میں جہاں ہر نقش آنکسی نقوش رکھتا ہے وہاں اپنی خواہشوں اور آرزوؤں کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا کیسا مسرت آگیاں احساس بخشا ہے وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا ویداریار سے حسین شاید کوئی نظارہ نہیں۔ اس نے سوچا۔ وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ فراک کی بجائے اس نے پین کلر کی قمیص سی کڑھائی والی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ شانوں پر کلف لگا دینا سلیقے سے پھیلا ہوا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ریشمی بال جو دوپونیوں میں بندھے رہتے تھے اس وقت ہیر پچ میں جکڑے کمر کو چھو رہے تھے۔ شبینہ کے بعد ممانے بے قراری سے اسے پہنچ لیا تھا۔

”میں کل شام کو ہی شبینہ سے کہہ رہی تھی کہ بڑا دل چاہ رہا ہے اپنی عروہ سے ملنے کو۔“ ممانے پہنچ کر کہہ رہی تھیں۔

”ایسے ہی پھوپھو! آپ تو لگتا ہے ہمیں بالکل ہی بھول گئی ہیں۔ ورنہ چھٹیوں میں تو آسکتی ہیں۔“ وہ شکوہ آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”میں کیا کروں بیٹی تمہارے انکل میرے علاوہ کسی کے ہاتھ کا بنا کھانا پسند ہی نہیں کرتے۔ اس وجہ سے میں تو بالکل پابند ہو کر رہ گئی ہوں۔“ ممانے اس کے سپید سپید چہنچے سے گال پر پیار کرتے ہوئے اپنے نہ آنے کی وجہ سے پیش کی۔

”بھائی پہچانا نہیں آپ نے عروہ کو؟“ شبینہ کی نگاہ اب اس کے ساکت و جامد سیراپار اٹھی تو اس نے کہا۔ ساتھ ہی وہ بھی مڑی تھی۔ خمیدہ پلکوں والی برائون آنکھیں اسے تک رہی تھیں اور راول کا ہاتھ جیسے ان آنکھوں میں کھو کر رہ گیا تھا۔ ادھر اس کی پر جوش سی والہانہ تلتی نگاہوں کی بے تحاشا



انتظام کرتی ہوں۔“

جوس پینے کے بعد وہ شینہ کی راہنمائی میں گیٹ روم کی طرف چلی گئی تو ڈرائنگ روم ایک دم خالی خالی لگنے لگا۔ ہر چیز جیسے بے رنگ سی ہو گئی۔ اپنے ان محسوسات پر راول حیران حیران سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے میں جانے سے قبل اس نے کچن میں جھانکا۔ ماما بڑی مسرور سی بھیجی کے لیے اہتمام کرنے میں مصروف تھیں۔

”مما! آپ تو بول خوش ہیں جیسے کسی ریاست کی شہزادی آئی ہو۔“ اس نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔

”میری بیٹی کسی شہزادی سے کم ہے کیا۔ پھر اتنے عرصے بعد تو آئی ہے۔“

”گویا جلدی جلدی آنے لگے تو پھر آپ خوش نہیں ہوں گی۔“ راول کو اس کی باتیں کرنے میں مزا آنے لگا۔

”کیوں نہیں ہوگی خوشی۔ میرا تو بس چلے تو بس ابھی سے اسے ہمیشہ کے لیے گھر لے آؤں۔“ وہ اپنے دھیان میں مصروف سے انداز میں کہہ رہی تھیں۔

راول کی دھڑکنیں یہ سن کر الوہی سے نفٹے کٹکٹانے لگیں۔ دل خوشی سے جھومنے لگا۔ ہر طرف جیسے رنگ ہی رنگ بھر گئے، فضا میں مشک بار ہو گئیں۔ بے اختیار راول کا دل چاہا بیٹھ کر ماما کا منہ چوم لے جو اس کے کہہ بنا اس کے دل کی خواہش جان گئی تھیں۔

”بھائی یہاں کیوں کھڑے ہیں جلدی سے ڈریس چینج کر لیں نا۔“ شینہ نے پیچھے سے کہا تھا اور وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا مبادا وہ اس کے چہرے سے اندر کا حال نہ جان لے۔

اپنا بہترین لباس زیب تن کیے وہ کب سے شیشے میں ہر طرف سے اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ کتنی دیر بال سیٹ کرنے میں لگائی تھی۔ وال کلاک کی جانب نگاہ کی اور پھر حیران رہ گیا۔ اتنا ٹائم تو اس نے کبھی بھی نہیں صرف کیا تھا تیاری میں، جتنا آج لگا چکا تھا۔ کیا محبت میں ہر انسان ایسا ہی انتہا پسند سا ہو جاتا ہے جیسے میں ہو رہا ہوں۔ ہاں محبت ایسا ہی جذبہ ہے، محبت کی

امرئیل من کے درمیانوں سے لپٹتی ہے تو ہر چیز سرسبز و شاداب دکھائی دینے لگتی ہے۔ ہر سو ہمار ہی ہمار دکھائی دیتی ہے۔ سائیں محبوب کے خیال سے ہی ممکنے لگتی ہیں۔ تصور کے افق پر ہر دم محبوب کا چہرہ جلمگاتا ہے اور اس چہرے پر قوس قزح کے رنگ ایسے دلفریب اور حسین دکھائی دیتے ہیں کہ اس نظارے کے سامنے دنیا کا حسین سے حسین منظر بھی ماند پڑ جاتا ہے۔

ڈھیر سا راپر فیوم اسپرے کر کے جب وہ کمرے سے نکلا تو ہر سو جیسے خوشبو ہی خوشبو بکھر گئی۔ ماموں جان آچکے تھے بڑی گرم جوشی سے اس سے ملے۔ ماما مسرور سی بھائی کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ شینہ اور وہ ڈھیروں کھانے کے لوازمات سامنے رکھے باتوں میں مگن تھیں۔ اس کی آمد کا اس ستم شعار نے کچھ نوکس ہی نہیں لیا تھا۔ راول کو اپنی ساری تیاری بے کار نظر آئی۔ وہ سخت جھنجھلاہٹ کا شکار ہونے لگا۔ ماموں اس سے اس کی اسٹڈی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ فیوج میں اس کے کیا عزائم تھے جانتا چاہتے تھے۔ وہ دلی کیفیت پر قابو پا کر احترام سے ان کی باتوں کا جواب دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ماموں بھی ماما سے باتوں میں مصروف ہو گئے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ یہاں کیا کرے۔ وہ خود کو بالکل گاؤدی سا محسوس کر کے بے چینی سے پہلو بدلتے لگا۔

”بھائی! اتنی دور کہاں بیٹھے ہیں یہاں آجائیں۔ بڑے مزے کی چیزیں بنائی ہیں ماما نے۔“ شینہ کو آخر اس کا خیال آئی گیا اور وہ تو جیسے بلاوے کا ہی منتظر تھا فوراً ان کے برابر والے صوفے پر آ بیٹھا۔

”یہ تم لوگ کھا رہی ہو یا سوٹھ رہی ہو۔“

”بیٹا جی یہ بھی کیا کریں اگر صحیح طرح سے کھائیں تو باتوں میں کچھ گیپ آتا ہے اور یہ انہیں منظور نہیں۔“ ماموں جان نے مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جھینپ سی گئیں۔

اسی وقت پاپا بڑے جوش و خروش سے سام کرتے ڈائنگ روم میں داخل ہوئے۔

”میں لیٹ تو نہیں ہوا نا؟“ وہ بڑے تپاک سے

”کیا کروں عاتکہ۔ دفتر کی ساری ذمہ داری تو میرے اوپر ہے۔ اب یہ جو چینی پارٹی آئی ہے اسے ڈیل کرنا ہے۔ ارباب صاحب خود تو ملک میں ہوتے نہیں۔ سب کچھ میرے اوپر چھوڑ رکھا ہے اس لیے میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ انہیں میری طرف سے مایوسی نہ ہو۔“ انہوں نے تفصیل سے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

”عروہ سیکنڈ ایئر کے ایگزٹام دے لے تو میں نظامی صاحب کو یا راول کو بھیجوں گی کچھ دنوں کے لیے بھیج دیجئے گا رہنے کے لیے۔“ وہ بھائی سے کہہ رہی تھیں اور راول ابھی سے دل ہی دل میں حساب لگانے لگا تھا کہ ایگزٹام میں کتنے ماہ رہتے تھے۔ پھر اس نے سارا عرصہ یہی حساب کرتے گزارا تھا۔ کئی مرتبہ فون کیا کہ شاید وہی دشمن جاں اٹھا لے مگر ہر مرتبہ یہ ناکامی ہوئی۔ وقت کی رفتار لگتا تھا جیسے ٹھہر سی گئی تھی۔ دن کچھوے کی چال کی مانند رینگتے رینگتے گزر رہے تھے یا اسے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا۔ ہر دم بس یہی خیال اسے گھیرے رہتا تھا کہ کب اس کے ایگزٹام ختم ہوں گے کب وہ آئے گی۔ پتا نہیں ماما کو یاد بھی ہے یا نہیں۔ بس ہر دم وہ ایسی ہی باتیں سوچتا رہتا۔ کتابیں کھولتا تو ہر ورق سے اس کا چہرہ ٹھٹھکتے لگتا۔ کتنے بے شمار دنوں کے بعد خود کو کافی گھبراہٹ سے آخر اس نے پوری تندرستی سے پردھنا شروع کیا۔

بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ درخت سبز پتوں کا پیراہن پہنے سرشار تھے۔ پودے پھولوں سے لہلہے تھے۔ اس شام موسم بے حد خوشگوار تھا۔ صبح میں کچا ٹیسٹ تھا اور طبیعت بھی کچھ ست سی ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے آج وہ ٹینس کھیلنے بھی نہیں گیا تھا۔ پڑھتے پڑھتے تھکن سی محسوس ہونے لگی تو وہ کتابیں بند کر کے کمرے سے نکل آیا۔ لاؤنج سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ ادھر ہی چلا آیا۔

”شکر ہے بھائی آپ آگئے۔ ورنہ میں سخت بور ہو رہی تھی۔ ماما تو میری بات ہی نہیں سن رہیں۔“ شبنم اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر بولی۔ راول اس کے سر

وں سے گلے ملتے پوچھ رہے تھے۔  
”ٹلیٹ ہو جاؤ اور تم۔ میرے خیال میں تو ایسا ممکن نہیں۔“ ماموں جان نے فراخ دلی سے ان کی تعریف کی۔

”بس یار جو نہی تمہاری بہن کا فون ملا کہ جلدی پینچیں تو میں فوراً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا، مبادا دیر ہو جائے اور ٹیکم کی جھڑکیاں سننی پڑیں۔“ وہ ماما کی دیکھتے شرارت بھرے انداز میں کہہ رہے تھے۔ وہ بری طرح جھینپ کر نگاہیں چرا رہی تھیں۔  
”جان کھلا کھلا کر ہنس دے۔ ماموں جان اور پاپا میں فرسٹ کزن بھی تھے اس لیے آپس میں بے لطف بھی تھے۔ اس وقت بھی کزن اور سالے کی آمد وہ بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ عروہ کو انہوں نے سنا ہی نہیں تھا۔

عروہ نے جب دیکھا کہ انکل تو اس سے ملے بغیر ہی گئے ہیں تو وہ جلدی سے آگے بڑھی۔

”السلام علیکم انکل میں بھی موجود ہوں یہاں۔“ حسین میرا بھی کچھ تعلق ہے آپ سے۔“ اس کی بات پر سب بے اختیار مسکرا دیے تھے۔ پاپا سے مڑے۔

”اوہ۔۔۔ واقعی تم عروہ ہو۔ مگر عروہ تو اتنی ذرا سی تھی۔“ پھر مسکرا کر اس کے سر پر بوسا دیتے ہوئے ”اب تم کہہ رہی ہو تو مانے لیتے ہیں کہ تم ہی کیوں حسین تم کیا کہتے ہو، مانیں یا نہ مانیں؟“  
انہوں نے شرارت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے وہ بری طرح جھینپ گئی۔ رخسار پل میں لال ہو گئے راول دلچسپی سے شوق سے یہ منظر دیکھتے

”ان ایسے گزر گئے تھے جیسے دوپل۔۔۔ وقت کو کبھی بھی کیسے پر لگ جاتے ہیں۔ راول نے بے کلی

”بھائی! آئے بھی ہیں تو اتنی جلدی جارہے ہیں۔ ہمارے دن تو اور رہتے نا۔“ ماما فردگی سے کہہ

پر چپٹ لگاتے ہوئے اس کے برابر آبیضا تو وہ گود میں دھرا اہم اٹھا کر اپنی فرینڈ کی تصویریں اسے دکھانے لگی۔ ساتھ ساتھ ان کے بارے میں بتانے لگی۔

”ویسے سنی یہ کچھ غیر اخلاقی سی حرکت نہیں لگتی یوں کسی کی تصاویر دکھنا۔“ اس کے پر شوق سے انداز پر راول نے قدرے رکتے رکتے کہا۔

”کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں بھائی۔ یہ سب کوئی پردہ تھوڑی کمری ہیں پھر غیر اخلاقی حرکت تو تب ہو کہ کوئی لڑکی اس بات سے منع کرے کہ گھر میں بھائیوں کو یا ان کے دیگرہ کو تصویریں نہ دکھاؤں اور اس کے باوجود گھر جا کر سب کو دکھاؤں مگر آج کے دور میں اس بات کو بڑا دقیانوسی سمجھا جاتا ہے۔ ہماری ایک کلاس فیلو ہے امیر، پہلے وہ یہ اہم لے کر گئی ہوئی تھی اگلے دن واپس لائی تو بڑی خوش خوش ہوتا ہے لگی کہ اس کے بھائی کو فلاں فلاں لڑکی کے فوٹو کرافٹ بہت پسند آئے۔ میں سوچ رہی تھی کہ حائق ضرور اس بات پر ناراض ہوگی مگر اس نے تو ذرا بھی نوٹس نہ لیا۔“ اس نے تفصیل سے راول کی بات کا جواب دیا۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد قدرے ہنسنے لگی ہوئی بولی۔

”بھائی! اصل میں میں یہ اہم اس لیے آپ کو دکھا رہی تھی کہ۔“

”ہاں ہاں۔ بتاؤ بھی رک کیوں گئیں؟“ راول نے اسے ہچکچاتے دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

”یہ جو حائقہ کی کزن ہے نا، ہمارے ہی کالج میں پڑھتی ہے۔ بے حد سویری ہے۔“ ایک تصویر پر فکر دھریے وہ بڑے شوق سے بتا رہی تھی اور راول اس کی ان تعریفوں پر دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا۔

”میرا دل چاہتا ہے بھائی! میں اسے اپنی بھابی بنالوں، سچی بھائی! انہی کیوٹ سی ہے نا۔ عادات بھی بے حد اچھی ہیں۔“ وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان تھی اور راول کے تصور میں ایک دم سے عروہ حسین آمو جو ہوئی۔ وہ جو اس کے نو عمر دل کی اولین تمنا تھی اس کی سب سے انمول خواہش تھی۔ بھلا اس کی جگہ کون لے سکتا تھا۔ اس سے اچھا پورے جگہ میں اور

کون ہو سکتا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ ”کہاں کھو گئے بھائی؟“ شبینہ شوخی سے اس کے کندھا ہلاتی ہوئی پوچھ رہی تھی۔ اسے تصورات کی دلدل کو خیر یاد آنا پڑا۔

مشاعرہ ختم ہوا تو ریموٹ کنٹرول سے آواز کرتے ہوئے ماما بھی ان کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

”ماما! آپ جس طرح محو ہو کر شاعری سنتی ہیں مجھے خواہ وہ ان شاعروں سے چڑھوس ہونے ہے۔“ اس نے ان کا ہاتھ تھام کر لاڈ سے کہا۔

”جب تم میوزک پر سر دھکتی ہو تو ماما کو تو ان پر چڑ نہیں چڑھتی۔“ راول نے اس کے سر پر ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لیں ماما بھائی کو تو بس موقع ملنا چاہیے اس نے ہنسنے لگی۔“

”راول مت تنگ کرو بھی میری بیٹی کو۔“ انہوں نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے راول سے کہا۔

”اچھا تمہیں کیا کہنا تھا مجھ سے۔۔۔ جو ان شاعر حضرات پر غصہ چڑھ رہا تھا۔“ وہ اس کی اس عادت اچھی طرح آگاہ تھیں کہ وہ جب کوئی خاص بات چاہتی تو انتظار اسے بڑا ٹھن دیکھائی دیتا۔

”ہاں۔۔۔ ماما! بھائی کے لیے یہ لڑکی اہم ہے میں نے۔“ اس نے جوش بھرے انداز میں جلدی اہم سیدھی کی اور انگلی رکھ کر تصویر دکھانے لگی۔

”ہیں۔۔۔ یہ لڑکیاں ڈھونڈنی کب سے شروع کر دی ہیں تم نے؟“ انہوں نے حیرانی سے اسے پوچھا۔

”ماما! آپ دیکھیں تو کیسی زبردست لڑکی اس نے ان کی توجہ اہم کی طرف نہ دیکھ کر جلدی کہا۔ وہ چند ثانیے خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔ ”سی! نہ تو شادی گڑیا گڈے کا کھیل اور نہ ہی صرف شکل و صورت کی بنیاد پر ایسے کے جاتے ہیں اور بیٹا انسانوں کو جاننے اور

لے تمہاری عمر ابھی بہت کم ہے۔ پھر اپنے خاندان



لڑکیاں ہوں تو ان ہی کو ترجیح دینی چاہیے۔ بے شک فیصلہ تو راول ہی کا ہوگا لیکن اس نے میری خواہش اور مرضی کو اولیت دی تو میری رائے یہی ہوگی کہ پہلا حق اپنوں ہی کا ہوتا ہے۔ کیوں راول تمہارا کیا خیال ہے؟ بڑے تدبرانہ انداز میں بات کرتے کرتے ساتھ ہی انہوں نے بیٹے سے پوچھ ڈالا۔

”میں آپ سے متفق ہوں ماما۔ میرے لیے آپ جو بھی فیصلہ کریں گی مجھے دل و جان سے قبول ہوگا۔“ وہ کسی حد تک ان کی خواہش سے آگاہ تھا اس لیے بلا دھڑک بولا۔

”مگر مجھے خوشی تبھی ہوگی اگر آپ کی پسند کردہ لڑکی شبینہ کو بھی پسند ہوگی تو۔۔۔“ اس نے بہن کا مان بڑھانے کے لیے اسے خوش کرنے کے لیے کہا اور واقعی وہ اتنے میں ہی مطمئن ہو گئی۔

”ابھی تو کافی عرصہ پڑا ہے راول کی تعلیم ختم ہونے میں۔“ وہ دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے بولیں۔ ”ایگزامز کب ہو رہے ہیں راول؟“

”ابھی تو دو اڑھائی ماہ پڑے ہیں ماما۔“ اس نے بتایا۔ ”ماما میرا خیال ہے آپ کی بھیجی کے تو ایگزامز ختم ہونے والے ہوں گے۔“ وہ جانے کس رو میں پوچھ گیا تھا اور اب جھل سا جھینپا جھینپا سا بیٹھا تھا۔ ماما نے ایک لمحے کو حیرانی سے اسے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔

”کون سی بھتیجی کے؟“ انہوں نے قدرے حرارت پھرے انداز میں پوچھا۔ شبینہ بغور بھائی کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کمال ہے یہ راول بھائی کے لیے جیسے رستم نکلے ہیں۔ بھائی کی پسند پر اسے دل کی ہوئی تھی۔ پتا نہیں پہلے اس کا دھیان اس طرف ہوا تھا۔

”ماما! بھائی عروہ کی بات کر رہے ہیں۔ اسے ہی تو نے ایگزامز کے بعد بلوانے کو کہا تھا۔“ اس نے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔“ ماما نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔ ”ماما! بھائی کی تعلیم مکمل ہونے میں تو ابھی خاصا

عرصہ پڑا ہے، کیوں نہ ابھی بھائی کی منتفی کر دیں۔ کچھ تو ہلا گلا ہو۔“ شبینہ نے ماما کو راہ دکھائی اور اس کی اس بات پر راول کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ دل میں بہن کو ڈھیروں دعا میں دے ڈالیں۔

”خیالی تو تمہارا اچھا ہے۔ تمہارے پیار آلیں ان سے بات کر لی ہوں۔ کیا کہتے ہیں بھلا۔“ انہوں نے کہا اور کھانے کا انتظام کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ہر سو مسرتوں کی پریاں رقصاں تھیں۔ بہار کی دلفریبیاں من کو گدگدا رہی تھیں۔ نگار سجیں تھیں گلاب راتیں تھیں۔ گو ماما، پیار اور شبینہ ابھی لاہور سے نہیں لوٹے تھے مگر شبینہ نے اس کی ہدایت کے مطابق اسے ساری باتوں سے آگاہ کر دیا تھا وہ جو سدا سے اس کے دل میں بستی تھی جس کی چاہت اس کی رنگ رنگ میں خون کے ساتھ گردش کرتی تھی اس کے نام کر دی گئی تھی بس کچھ ہی عرصہ تھا۔ پھر اسے ہر لمحہ ہر بل اس کی نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ یہ تصور ہی یہ خیال ہی راول پر سرخوشی کی سی کیفیت طاری کر دیتا تھا۔

وہ موسم بہار کا ایک بے حد خوبصورت دن تھا جب اس نے اس کی سپید سپید مخرومی انگلی میں منتفی کی انگوٹھی پہنائی تھی۔ اس کے چہرے پر پھرے قوس قزح کے دلفریب رنگوں نے راول کے دل میں کیسے کیسے ارمان نہیں جگائے تھے۔ لبوں کی تراش میں جی شرمیلی سی مسکراہٹ نے اسے بے خود سا کر دیا تھا۔

کئی ڈھیروں منتوں سے اس نے انظار آپا کو منایا تھا کہ وہ اسے لباس نہیں بدلنے دیں گی اور اسی طے، اسی سند روپ میں تھوڑی دیر اس سے بات کر لینے دیں گی۔ ڈھیروں باتیں تھیں جو وہ اس سے کرنا چاہتا تھا۔ اپنی چاہت کا اقرار اس سے سننا چاہتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وقت کو بر لگ گئے تھے۔ چند منٹ ایسے گزرے کہ اسے پتا بھی نہ چلا۔ ابھی تو نگاہوں کی پیاس بجھی تھی نہ دل ہی دیدار یار سے سیر ہوا تھا، یوں نے کچھ کہا تھا نہ کانوں نے سنا تھا کہ انزلہ آیا آگئی تھیں۔ ”جلدی سے آو راول، تمہارے کسی دوست کا

جسم پر گرے تو وہ چونک بڑا۔ آسمان پر ہر طرف گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

”اوہ میرے خدا۔ ممانے اگر ماموں کی طرف فون کر لیا تو بے حد پریشان ہو جائیں گی۔“ اس نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سوچا۔

باہر آسمان برس رہا تھا اور اندر اس کی آنکھوں نے جل پھل کیا ہوا تھا۔ راول کی دکھ اور حیرت سے کھلی آنکھیں اس کے دماغ سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

وہ آنکھیں جن سے ہر دم محبت کی شعاعیں پھوٹا کرتی تھیں وہ آنکھیں جو بس چاہتوں کی برکھا برساتا جانتی تھیں۔ کیسے ان میں درد ہی درد پھیل گیا تھا۔ حیرت اور

بے یقینی جیسے ان میں نمود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور ان آنکھوں میں یہ طغیانی لانے کا سبب وہ خود بھی۔ یہ اس کی زبان سے نکلنے والے لفظوں کے تیرتھے جنہوں نے

راول کو زخم زخم کر دیا تھا۔ اس کا مان اس کا اعتماد ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ اور یہ میرے خود اس کے اپنے وجود کو بھی لہو لہان کر گئے تھے۔ وہ اگر ٹوٹا تھا تو وہ خود بھی تویری

طرح کرچی کرچی ہو گئی تھی۔ وہ جیسے ہارے ہوئے شکستہ قدموں سے واپس ہوا تھا وہ منظر اسے کیسے

کیسے نہیں رلا رہا تھا۔ اف! اس قدر اذیت ناک ہے یہ سب برداشت کرنا۔ اس نے درد سے پھٹتے سر کو

دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے سوچا۔ کیا کرے وہ؟ کیا اپنا فیصلہ بدل دے؟ سب کچھ قسمت پر چھوڑ دے اور خود کو حالات کے دھارے پر بسنے دے۔ کیا صحیح ہے کیا

غلط۔ جانے کس وقت الجھتے الجھتے نیند کی دیوی نے اس کے تھکے پارے وجود کو اپنی مہمان بانہوں میں سمیٹ

لیا اور وہ وقتی طور پر زندگی کے بھنبھنوں سے آزاد ہو گئی۔

صبح جب کافی دیر تک وہ اپنے کمرے سے نہ نکلی تو

انزلہ آپی پریشان سی چلی آئیں۔ اس کی سوچی ہوئی

آنکھیں اور اترا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئیں۔ ہاتھ

تھامتا تو وہ تپ رہا تھا۔

”عروہ! تمہیں تو بہت سخت بخار ہے۔“ انہوں

نے فکر مندی سے کہا۔ اور پھر اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود وہ اسے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔

ڈاکٹر عابد کے پاس کافی رش تھا۔ وہ دونوں ایک طرف لگے صوفوں پر آ بیٹھیں۔ حالانکہ گیٹ سے

صرف چند قدم کے فاصلے پر ہی ڈاکٹر عابد کا کمرہ تھا مگر اس وقت اس ذرا سے فاصلے نے ہی اسے تھکا ڈالا۔

آنکھیں موندتے ہوئے اس نے سر صوفے کی پشت سے نکالیا۔

”ہیلو عروہ۔“ مانوس سی آواز تھی اور کندھے ہاتھ کا دباؤ۔ عروہ نے جلدی سے آنکھیں کھول کر دیکھا

وہ اس کی کلاس فیلو ورہ تھی۔ ”کیا ہوا ہے عروہ؟“ اس قدر زرد کیوں ہو رہی ہو؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے

پوچھ رہی تھی۔ ”زرد نہیں بھئی، بس ہلکا سا بخار ہے مگر انزلہ زبردستی گھسیٹ لائیں، تم سناؤ کیسی ہو؟ ادھر کیسے نظر

آ رہی ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”رومان آپی ایڈمرٹ ہیں یہاں، میری فرسٹ

کزن ہیں ان کی عیادت کے لیے آئی تھی میں امی کے ساتھ۔ وہ سو رہی ہیں اور امی دبا آئی کے ساتھ ہال میں

لنگ گئی ہیں۔“ ”دبا آئی؟ کیا سمن آباد میں رہتی ہیں یہ۔۔۔؟“

”ہاں ہاں، آپ کیسے جانتی ہیں انہیں؟“ ”ہمارے ساتھ والا گھر ہی تو ان کا ہے۔“

”ٹریجڈی ہوئی ہے بے چاری رومان کے ساتھ بھی اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔“ ”انزلہ آیا ہے ہمدردی سے کہا تھا۔“

”بعض لوگ اپنی قسمت خود ہی خراب کر لیتے ہیں آپی اور بعد میں تقدیر کو دوش دینے لگتے ہیں

تمہیں سوچتے کہ یہ تو ہمارے اپنے اعمال کی ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟“

پوری توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی اس

چونک کر بے حد بے چینی سے پوچھا۔

”مطلب میں تمہیں بتانی ہوں بیٹی۔“

پچھے سے اچانک سامنے آتے ہوئے کہا تو ایک  
لے کے لیے وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ وردہ کی حالت سب  
سے تپتی تھی۔

”او کمرے میں آ جاؤ تم لوگ۔“ اس نے عروہ کا  
ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو وہ تینوں ایک دوسرے کی طرف  
بھاگیں ان کے پیچھے چلنے لگیں۔

رومان سو رہی تھی، زردی اس کے چہرے پر یوں  
پھیل رہی تھی جیسے ہلدی مل دی گئی ہو۔ آنکھوں کے  
سایہ حلقے صاف نظر آرہے تھے۔ ”بیٹھو تم لوگ۔“  
اس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
خاموشی سے بیٹھ گئیں۔ عروہ کی نگاہیں رہ رہ کر رومان  
کے کمزور سر یا پر جا ٹھہرتیں اور وہ دل ہی دل میں اس پر  
دھانے والوں کو کونے لگتی۔

”تمہاری امی اس دن مارکیٹ میں ملی تھیں،  
اسی تھیں کہ رومان کے ساتھ ہونے والے حالات  
میں اس قدر خوف زدہ کر دیا ہے کہ تم شادی سے  
انکاری ہو۔ تو عروہ بیٹی اصل حالات وہ نہیں ہیں جو تم  
کو رہی ہو۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ  
تمہارے سامنے اقرار کر لوں کہ قصور ہمارا اپنا ہے۔  
میرے لفظوں میں یہ ہمارے اپنے ہی اعمال کی سزا  
”انہوں نے دھیرے دھیرے کہا۔ وہ تو یہ سمجھ  
تھی کہ وہ ناراضگی سے کہہ رہی ہیں مگر وہ بالکل  
سچی ہیں۔

”یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ میں نے رومان کی شادی  
کی بہن کے گھر کی۔ بیٹی کی شادی کرتے ہی بہن کی  
جانے کہاں جاسوئی تھی کہ عام سی بات بھی رومان  
بانتی کہ آئی نے مجھے یوں کہا ہے تو مجھے بے حد  
آگ۔ اس غصے کی حالت میں میں نے انتہائی عصبیت  
کا ثبوت دیتے ہوئے رومان کو یہ بیٹی پر حملی کہ وہ  
کاٹو کر لے۔ باقی گھر والوں کی کوئی بات سننے کی  
ضرورت نہیں۔ رومان ویسے بھی قدرے تیز  
تھی۔ میری شہ پر اس نے سسرال والوں کو بالکل  
رکھ لیا، فراز جو پہلے ہی محبت کرتا تھا اب جو اس  
طور پر اس کی آؤ بھگت کی تو وہ اس کا دیوانہ

ہو گیا مگر اس کے خیر میں گندھا ماں باپ کا احترام اور  
بہن بھائیوں کی محبت وہ تمام تر کوشش کے باوجود نہ  
نکل سکی۔ شروع شروع میں تو وہ اس کے والدین سے  
ناروا رویے پر نرمی سے سمجھانے پر اکتفا کرتا رہا مگر اس  
کی نرمی سے ہم لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ رومان تو  
پھر بچی تھی مجھے بھی عقل نہ آئی۔ رومان کے ہاں بیٹے  
کی سیدائش ہوئی تو میں نے جانا کہ اب اس کے قدم  
اس گھر میں اتنے مضبوط ہو گئے ہیں کہ اب وہ جو مرضی  
کرتی رہے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ پتا نہیں کبھی  
کبھی ہم اپنی دوغلی پالیسی کیوں اپنا لیتے ہیں کہ بہو کی  
وہی باتیں وہ رویہ جو ہمیں بے حد گراں گزرتا ہے وہی  
رویہ جب بیٹی اپنی سسرال میں اپناتی ہے تو ہم خوش  
ہوتے ہیں اور اس پر بڑا فخر کرتے ہیں ہماری بیٹی کا  
سسرال میں بڑا رعب و دبدبہ ہے۔ بڑی چلتی ہے اس  
کی پتا نہیں ان دنوں کیا ہو گیا تھا مجھے ہر وہ بات جس پر  
میرا فرض تھا کہ میں رومان کو نوٹی اسے سمجھاتی تھیں  
اس پر خوش ہوتی بے حد کم ظفری پر اثر آتی تھی میں پتا  
نہیں اولاد کی محبت میں یا کم ظفری میری بیٹی میں ہی  
شامل تھی۔ ”انہوں نے ایک گہری ٹھنڈی آہ بھری اور  
چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئیں۔ عروہ نے بے حد  
مأسف سے اس کی جانب دیکھا۔

”ماس نند اگر بچے کی چاہ میں کمرے میں چلی  
آتیں تو رومان کے ماتھے پر ہل پر جات۔ وہ اگر بچے کو  
اپنے کمروں میں لے جانے کی خواہش ظاہر کرتیں تو یہ  
صاف منع کر دیتی۔ بس بیٹی کیا کیا بتاؤں ہم نے حد ختم  
کر دی تھی ورنہ میری بہن نے تو بہت صبر کیا اور شاید  
اس کا صبر ہی پڑا ہے ہم پر۔ فراز نے رومان کی ہر زیادتی  
کو برداشت کیا۔ مندوں نے کبھی دبدو اس سے زبان  
نہیں چلائی۔ دیور نے کبھی بد تمیزی نہیں کی۔ بہت  
ڈھونڈنے سے بھی کہیں ان کی کوئی خطا نظر نہیں آتی۔  
ساری غلطیاں ہماری ہیں۔ ساری خطائیں ہماری ہیں۔  
وردہ تھک کہہ رہی تھی ہمیں اپنے ہی اعمال کی سزا ملی  
ہے۔ مائیں تو بیٹیوں کا گھر بساتی ہیں، انہیں اگلے گھر کو  
جنت نظیر بنانے کے گر سکھاتی ہیں مگر میں کیسی ماں



ہوں جس نے اپنی کم عقلی اور نادانی کی وجہ سے بیٹی کا گھر  
اجاڑ دیا۔ اسے برباد کر دیا۔ آہ۔ کس قدر ظلم کیا ہے  
میں نے۔ خود اپنی ہی اولاد کے ساتھ۔ کچھ تاؤوں کے  
ناگ دن رات مجھے ڈستے ہیں۔ اپنی ہی نادانیاں ہر دم لہو  
رلاتی ہیں۔ آہ۔ اب کچھ تاؤے کیا ہوت جب  
چڑیاں چک گئیں کھیت۔

اس دن جو کچھ ہوا وہ جس قدر غیر متوقع ہمارے  
لیے تھا یقیناً "اسی قدر میری بہن کے گھر آنے کے لیے  
بھی تھا۔ میں اس دن بازار سے واپسی پر روانہ کی طرف  
چلی گئی تھی۔ وئی کے لیے کچھ چیزیں لی تھیں سوچا دیتی  
حالی ہوں۔ وئی اب واکر میں چلنے لگا تھا۔ رومان کی  
کوشش ہوتی تھی کہ وہ باہر نہ نکلے مگر وہ بچہ تھا جو کسی  
دروازہ کھلتا باہر نکل جاتا۔ وہ کمرے تھے رومان کے پاس  
جگہ ہی کہاں تھی اتنی اس کے کھیلنے کے لیے۔ اس  
دن جو کسی وہ باہر نکلا وادی اسے اٹھا کر پونے لگیں۔  
رومان نے دیکھتے ہی اس بری طرح سے اسے ان سے  
جھپٹا کہ وہ جو کئی دنوں سے بیمار تھیں سنبھل نہ سکیں  
اور دھکا لگنے کی وجہ سے دیوار سے جا ٹکرائیں۔  
کنزوری تھی یا صدمہ یا ہم لوگوں کی شامت اعمال کہ  
دیوار سے ٹکرا کر وہ نیچے گر کر بے ہوش ہو گئیں۔ یہ  
سارا کچھ فراز نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں جو ٹنگ  
سی ساکت و جاہد کھڑے فراز کو دیکھ رہی تھی تیزی سے  
آگے بڑھی اور اسی وقت اسے جیسے ایک دم ہوش  
آگیا۔ اس نے چیخ کر چھوٹے بھائی سرفراز کو آواز دی جو  
ڈاکٹر ہے پھر لپک کر رومان کی طرف بڑھا۔ وئی کو چھین  
کر رومان کو میری طرف دھکا دیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ  
سے شعلے کی مانند وہ لفظ نکلا جس نے سب کچھ پل میں  
جلا کر خاکستر کر ڈالا۔۔۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔۔۔ سب  
کچھ۔۔۔ وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے بری طرح  
سکھنے لگیں۔

وہ تینوں پتھر کے بتوں کی مانند ساکت و جاہد بیٹھی  
انہیں دیکھتی رہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے  
انہیں چپ کروائیں۔ کون سا حرف تسلی کہیں جو ان  
کے دکھ کا دوا بن جائے جو ان کے زخموں پر مرزم کا کام

دے جائے مگر بے حد سوچ بچار کے باوجود کوئی ایسا  
بھائی نہیں دے رہا تھا بلکہ زبان سے نکلنے کو تیار  
تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے حرف و لفظ کا نا تابیہ  
لیے زبان سے منقطع ہو گیا ہو۔ آخر درودہ کی امی  
آگے بڑھ کر دھیرے سے ان کے کندھے پر ہاتھ  
ہوئے۔ انہیں ساتھ لگایا اور آہستہ آہستہ دلاسا  
لگیں۔ رومان بھی جاگ چکی تھی اور خالی خالی  
سے انہیں تک رہی تھی۔ انزلہ آئی اور درودہ  
جاگتے دیکھ کر اس کی طرف بڑھیں جبکہ عروہ کم  
کیفیت میں ساکت بیٹھی آئی ویا کی جانب  
کافی دیر کے بعد جب وہ کسی حد تک سنبھل  
دھیرے سے اسے مخاطب کر رہی ہوئی بولیں۔

”عروہ بیٹی! ہمیشہ ساس کا قصور نہیں ہوتا۔  
شوہر غلام اور بے حس ہوتا ہے۔ کبھی کبھی شوہر  
ہی اپنی برائی کا سامان کر لیتی ہیں اور کبھی  
عاقبت نا امدیش مائیں بیٹیوں کو اجاڑ ڈالتی  
انہوں نے طویل اور ٹھنڈی سانس لی اور بے حد  
سی بیٹی کی طرف تے لگیں۔

”میرا تو یہ خیال ہے آپا کہ ہم اپنی بیٹیوں  
دن ہی یہ سمجھائیں کہ جیسے ہم تمہارے لیے  
احترام ہیں اسی طرح شوہر کے والدین بھی  
نزدیک عزت و احترام کے حق دار ہونے چاہئیں  
دل کی گہرائیوں سے انہیں والدین کی جگہ دے دو  
تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں  
سرال والوں کی بہت سی باتیں صرف اس  
بریں تھیں کہ دل میں پہلے سے ان کے  
کدورت ہوئی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی

انتہائی خوش بختی ہے۔ جبکہ ہم ماؤں کا فرض تو یہ ہے کہ ہم اپنی بچیوں کو ہر طرح کے حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کریں۔ یہ طے ہے کہ من چاہی زندگی ہر کسی کو نہیں ملتی۔ ہاں صبر و استقامت، ہمت و حوصلے اور فہم و فراست کے اوصاف کو بروئے کار لاتے ہوئے زندگی کو اپنے پسندیدہ ڈھب پر لایا جاسکتا ہے۔ مسلسل کوشش سے حالات کو وقت کو اپنا تابع ضرور کیا جاسکتا ہے گو ایسا کرنا کچھ مشکل ضرور ہے مگر ناممکن قطعی نہیں۔ مجھے تو کامل یقین ہے کہ اگر ہم اپنی بیٹیوں میں یہ اوصاف پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو کوئی گھر کبھی برباد نہ ہو۔ کوئی بیٹا کبھی اجڑ کر میکے نہ آئے عورتوں کی بات ہے کہ محبتوں اور چاہتوں کی قدیلوں سے راہیں روشن ہوں تو منزل پر پہنچنے میں راہی کا کیا کمال۔ کمال تو یہ ہے کہ راہیں لامبوس کی رات جیسے گھور اندھیرے میں چھٹی ہوں اور بندہ اپنے اندر کی روشنی سے راہوں کا تعین کرنا اور اُدھر بھٹکے بنا سیدھا منزل پر جا پہنچے۔

ان کے لہجے میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ وہ سحرزدہ سی سن رہی تھیں۔ ایک ایک لفظ جیسے دل کی گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں کچھ لوگوں کے پاس یہ کیسا فن ہوتا ہے یا پھر یہ خدا داد صلاحیت ہوتی ہے کہ لفظ ان کے منہ سے نکلتے ہیں اور سننے والے کے دل میں اتر جاتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ دل میں اترتے ہیں بلکہ اندر کی حالت کو یکسر بدل ڈالتے ہیں۔ وہ دونوں بہنیں بھی جب اس اسپتال کی عمارت سے باہر نکلیں تو ان کی دل کیفیت پہلے سے بے حد مختلف تھی۔ انزلہ ایک نئی سوچ کے ساتھ سرال جانے کا سوچ رہی تھی۔ عروہ بھی اپنے شادی نہ کرنے کے فیصلے کو پچکانہ بلکہ بے وقوفانہ قرار دیتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ شادی نہ کر کے ہر وقت بھائیوں کی جلی گلی باتیں سننے اور والدین کے بعد باجھ ہواؤں کی مانند کبھی ایک بھائی اور کبھی دوسرے بھائی کے پاس ڈولتے پھرنے سے ہزار درجے بہتر تھا کہ ایثار و قربانی اور صبر و استقامت کو اپنا شعار بناتے ہوئے ایک ایسے آشیانے کی بنیاد رکھی جائے

سمجھائیں کہ اگر کسی وقت ساس سربراہ بھلا کہہ بھی دیں تو یہ سوچ کر برداشت اور تحمل سے کام لیں کہ اپنے والدین بھی تو ڈانٹ ڈپٹ دیتے ہیں اگر انہوں نے کچھ کہہ دیا ہے تو پھر کیا ہے۔ دوسرا ہمیں اپنی بچیوں کو یہ سمجھانا چاہیے کہ گزارا صرف شوہر سے نہیں ہوتا بلکہ پورے خاندان سے نبھانا پڑتا ہے۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لیے پورے خاندان کو سمجھنا پڑتا ہے۔ پورے خاندان کو سمجھنے کے لیے سب کے دل میں اترنے کے لیے کیسا رویہ اختیار کیا جائے۔ کون سا کر آملایا جائے یہ سب بتانا۔ ایسی ساری باتیں سمجھانا ہم ماؤں کی ہی ذمہ داری ہے۔ انزلہ آپا اور وردہ رومان سے ملنے کے بعد ان کے قریب آئی تھیں اور بغور ان کی باتیں سن رہی تھیں۔

”سب کو خوش رکھنا کیسے ممکن ہے آئی؟“ انزلہ

آپا نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”بالکل ممکن ہے بیٹی۔ ساس سر جو کچھ بھی کہیں ہنس کر سہ لیا جائے ان کو والدین سمجھ کر ان کو احترام دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہوا ان کے دل میں نہ بننا پائے۔ رہ گئے دیور، ننڈیں تو دیور تو ظاہر ہے تعلیم، جا ب یا بزنس کے سلسلے میں دن کا بیشتر حصہ باہر گزاریں گے ہاں جب وہ گھر آئیں تو خود کو بھالی سمجھ کر نہیں بلکہ ان کی بہن سمجھ کر جہاں تک ممکن ہو ان کی پھولی مولی ضروریات کا خیال رکھیں۔ ننڈوں کے ساتھ یوں گھل مل کر رہیں جیسے اپنی بہنوں سے رہتی ہیں۔ ان سے ان کی دلچسپی کے مطابق گپ شپ کریں۔ طریقے سے ان کے پسندیدہ موضوعات چھیڑ کر بات چیت کریں۔ اپنے کمرے میں لی وی

انزلہ دیکھنے کے بجائے سب کے ساتھ بیٹھ کر لی وی کریں۔ ان کی خوشیوں کو شیئر کریں۔ زیادہ کام ان پر نہ دے۔ بجائے ننڈ کرنے کی کوشش کریں تو یقیناً

اس ہو اور ننڈ بھاون کی روایتی چپقلش بعد اور بعض ننڈ ختم ہو کر رہ جائے اور وہ گھر جنت کا نمونہ نظر آئے۔ کسی لڑکی کو اچھا گھر، محبت کرنے والی مال اور حاشا کرنے والا شوہر مل جائے تو یہ اس کی

طنز سے انداز میں پوچھا۔  
 ”کمال ہے۔۔۔ وہ تو کچھ بولی ہی نہیں پھر اس نے  
 کیسے اسے پہچان لیا ہے۔ کیا محبت میں الہام بھی ہوا  
 کرتے ہیں۔“ اس نے حیرانی سے سوچا۔

”میرے پاس اتنا فالتو نام نہیں ہے محترمہ! جلدی  
 سے بتائیں کہے بلاؤں ماما کو یا پھر شبینہ کو؟“ وہ اکھڑے  
 اکھڑے سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ اس کا یہ انداز کس  
 قدر اجنبی سا تھا اس کے لیے۔ وہ تو ہمیشہ والہانہ انداز  
 میں ملا کرتا تھا۔ ایک دم اس کے دل کو جیسے کوئی مٹھی  
 میں لے کر بھینچنے لگے۔ ”اوہو بھئی بول بھی چلیں۔ کیا  
 گویائی ختم ہو چکی ہے۔“ اب وہ بری طرح جھنجھلا رہا  
 تھا۔

”راول! مجھے مجھے آپ سے ہی بات کرنا  
 ہے۔“ اس نے دھڑکھڑکرتے دل کو بمشکل سنبھال  
 اٹکتے اٹکتے کہا۔

”زہے نصیب۔۔۔ مریدی حیرت کی بات ہے۔  
 اس کا لہجہ ہنوز طنز ہے ساتھ۔  
 ”کیوں“ حیرت کی بات کیوں؟“ عروہ نے

اختیار کیا۔  
 ”عروہ حسین صاحبہ! اس خاکسار کو یاد کرنا  
 حیرت کی بات ہی تو ہے۔“

”راول! یاد تو انہیں کیا جاتا ہے جو کسی وقت  
 جائیں جو دل میں رہتے ہیں وہ تو ہر دم نگاہوں کے  
 رہتے ہیں کسی پل بھی نگاہوں سے اوچھل نہیں  
 پھر انہیں یاد کرنے کی نوبت کیسے آئے۔“ اس  
 ہمت کر کے کہا اور ریسیور کرڈیل پر ڈال دیا۔  
 یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہواؤں میں پرواز کر رہا  
 سو مسرتوں اور خوشیوں کی پریاں رقصاں  
 عجیب سے نشے سے سرشار بے خود کھڑا تھا۔

جس کا سب سے اہم ستون خود بنا جائے ایک ایسا ستون  
 جس کی عدم موجودگی سے اس کے آشیانے کی بقا کا  
 تصور بھی محال ہو۔ خود ساختہ سوچوں کا بار گراں دل و  
 ذہن پر سے اترتا وہ خود کو بے حد ہلکا محسوس کرنے  
 لگی۔ ساتھ ہی ایک نئی فکر نے آگھر آگھر اب راول کے  
 ساتھ کی گئی زیادتیوں کی تلافی کس طرح کرے۔ کیوں  
 نہ انزلہ کے ساتھ پھوپھی کی طرف چلی جاؤں اور اس سے  
 سوری کر لوں۔۔۔ میں یہ میرے لیے بڑا مشکل ہے۔  
 اس نے خود ہی سوچا اور پھر اس خیال کو سوچ کر روک بھی  
 کر دیا۔

”عروہ اترو بھئی۔۔۔ کمال گم ہو۔“ رکشا رک چکا  
 تھا اور انزلہ آباؤ راہیور کو کراہیے دینے کے بعد اسے اندر  
 ہی بیٹھے دیکھ کر حیرت ہوئی نگاہوں سے اسے ہمتی  
 اترنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ اف! کیا سوچے گا یہ  
 رکشے والا بھی۔ وہ جھل جھل سی نیچے اتر آئی۔  
 ”عروہ حد نہیں کر دی تم نے۔ کس سوچ میں گم  
 تھیں۔“ اس کے برابر چلتے ہوئے انہوں نے بغور اس  
 کا چہرہ دیکھا۔

”یونہی بس۔۔۔ درد کی امی کی باتوں پر غور کر رہی  
 تھی۔“ اس نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔

”ہاں بھئی کمال کی عورت ہیں تمہاری دوست کی  
 امی۔ میں تو ان سے بے حد امپرہس ہوئی ہوں۔ ایسے  
 لوگوں سے تو ملتے رہنا چاہیے۔ تم بیٹھو میں دودھ گرم  
 کر کے لاتا ہوں۔ میڈیسن لے کر کچھ دیر آرام کرو  
 انشاء اللہ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ انہوں نے محبت  
 سے کہا اور پتھن کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے دروازے  
 سے نکلتے ہی وہ تیزی سے فون کی جانب لپکی۔ ریسیور  
 کان سے لگاتے ہوئے کپکپاتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل  
 کیا۔ پہلی ہی بیل پر ریسیور اٹھالیا گیا تھا۔ ”ہیلو! اس  
 کی خوب صورت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ  
 یوں سرخ برنگی جیسے وہ اس کے سامنے ہی تو کھڑا ہو۔  
 لفظ ہمیشہ کی طرح کہیں گم ہونے لگے۔

”فرمائیے عروہ حسین، کس سے بات کرنا چاہتی  
 آپ؟“ چند لمحوں کے توقف کے بعد راول نے